

جدید نظریاتِ تعلیم اور اقبال

نظریے کا لفظ تعلیم میں کس مفہوم میں استعمال ہوتا ہے؟ سب سے پہلے ہمیں اس بات کی وضاحت کرنی چاہیے۔ علم عمل کی لازمی شرط ہے۔ اس لیے نظریہ، عمل کی ضد نہیں ہے۔ نہ ہی تعلیم میں یہ اس مفہوم میں استعمال ہوتا ہے جس میں یہ سائنس میں مستعمل ہے۔ سائنس میں نظریے سے مراد مربوط بیانات کا ایک سلسلہ ہے جو طبعی دنیا کے کسی پہلو سے متعلق ہمارے تجربے میں گنے والے حقائق کو منضبط کرتا ہے اور تجربی آزمائش کے ذریعے جس کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔ ڈی۔ جے۔ اکنور (D. J. O'Connor) اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ نظریے کو تعلیم میں بھی اس معیار پر پورا اترنا چاہیے، ورنہ وہ نظریہ نہ اسے کا مستحق نہیں۔ تعلیمی نظریہ چونکہ اس معیار پر پورا نہیں اُترتا، اس لیے وہ کتاب ہے کہ نظریے کا لفظ جب ہم تعلیم میں استعمال کرتے ہیں تو یہ محض "مروت" (COURTESY) کا ایک خطاب ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

اکنور کی یہ رائے تعلیم پر منطقی اثباتیت (LOGICAL POSITIVISM) کے فلسفے کے بڑھتے ہوئے اثر کی ایک مثال ہے، سب سے پہلے مقصد فلسفے کو تصور کی بلندیوں سے گھسیٹ کر حقائق کی دنیا میں آباد کرنا ہے۔ تعلیمی تصورات کا منطقی اثباتیت کے نقطہ نظر سے تجزیہ کرنا ایک بڑی علمی خدمت ہے۔ اکنور کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ سائنسی نظریے اور تعلیمی نظریے کی نوعیت میں فرق کو محسوس نہ کر سکا۔ پال ہرسٹ (PAUL HIRST) نے اپنے مضمون "فلسفہ اور تعلیم، نظریہ" میں جو نومبر ۱۹۶۳ء کے برٹش جرنل آف ایجوکیشنل اسٹڈیز میں شائع ہوا، اس کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے۔ سائنسی نظریات اور عملی کاموں کے

۱۵ ڈی۔ جے۔ اکنور، این انٹروڈکشن ٹو ریفلکشن آف ایجوکیشن، لندن، روٹ لیج اینڈ لیگن پال، ۱۹۵۷ء۔

ص ۱۱۰۔۔۔ اسی کتاب میں ایک اور جگہ وہ کتاب ہے "تعلیمی امور میں نظریے" (THEORY) کا لفظ "ایک ماخوذ

(DERIVAT) اور کمزور مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ ص ۷۵

اصول اپنی نوعیت میں بالکل مختلف ہوتے ہیں، کیوں کہ وہ مختلف قسم کے کاموں کے لیے وضع کیے جاتے ہیں۔ سائنس جسے نظریہ کہتے ہیں وہ مشاہدے اور تجربے پر مبنی تحقیق کا نتیجہ ہوتا ہے، فطرت کے کسی پہلو متعلق صحیح، مربوط اور مکمل علم حاصل کرنے کی کوشش کا ایک ثمر۔ یہ کوشش چار مراحل پر مشتمل ہوتی ہے۔ سائنس دان کو جب کسی واقعے کی اصل وجہ معلوم نہیں ہوتی تو حقائق کی روشنی میں پہلے وہ اس کے لیے ایک وجہ فرض کرتا ہے۔ قیاس پر مبنی اس وجہ کو سائنس کی اصطلاح میں مفروضہ (HYPOTHESIS) کہتے ہیں۔ شروع میں یہ مفروضہ ناکافی شہادت پر مبنی ہوتا ہے۔ تحقیق کے دوران میں اگر اس کے حق میں مزید شہادت مل جائے تو اس کے صحیح ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے اور وہ مفروضے سے ترقی کر کے ایک قابل عمل مفروضہ بن جاتا ہے۔ اب حقائق کی روشنی میں مفروضے کی تصدیق (VERIFICATION) اور توثیق (CONFIRMATION) کی باری آتی ہے جس کے بعد وہ ایک جائز (LEGITIMATE) مفروضہ بن جاتا ہے۔ چوتھے اور آخری مرحلے میں مفروضے کی آزمائش کے لیے کوئی فیصلہ کن مثال (CRUCIAL INSTANCE) تلاش کی جاتی ہے جس پر اگر وہ پورا اترے تو وہ مسلم الثبوت نظریہ بن جاتا ہے۔ یہی نظریے کی تحقیق کا سائنسی طریق کار۔ تعلیم جیسے عملی کام میں نظریے کی حیثیت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہاں درو صحیح، منظم اور جامع علم حاصل کرنے کی کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ عمل کی راہ متعین کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ وہ ہدایت، رہبری اور رہنمائی کا کام دیتا ہے۔ عملی اصول آپس میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، کیوں کہ ان کا تعلق مختلف قسم کے کاموں سے ہوتا ہے۔ تعلیم جس قسم کا عملی کام ہے اس میں نظریہ مختلف قسم کے علوم، اقدار اور عقائد سے مرتب ہوتا ہے، جن میں نفسیاتی اصول، معاشرتی اقدار اور فلسفیانہ اور مذہبی عقائد شامل ہیں۔ نفسیات، عمرانیات، فلسفہ اور مذہب یہ سب مل کر تعلیمی نظریے کا تعین کرتے ہیں۔

ہرسٹ اور اکنور کی فکر میں بنیادی فرق یہ ہے کہ کیا نتائج کو نظریہ کہا جاسکتا ہے؟ ہم یہ کہیں گے کہ دونوں کی حیثیت کم از کم نظریہ ہے، کیوں کہ ان کا تعلق عام اصولوں سے ہے جو تجربے سے حاصل ہوتے ہیں اور اس سے مسلسل مربوط رہتے ہیں۔ ”تعلیم پر نظری بھت میں ہم متعدد اور مختلف قسم کے علوم سے ماخوذ تصورات کی روشنی میں اپنے کام کا جائزہ لیتے ہیں اور ہمارا مقصد اپنے کام کو زیادہ معقول طریقے سے سمجھنا اور اسے بہتر بنانا ہوتا ہے۔“ کردار کی دنیا میں سب سے زیادہ اہم سوال ”کیا کرنا چاہیے“ کا سوال ہے۔ اس کے

یہ ضروری ہے کہ ہمیں اصل صورتِ حال، اس کی تاریخ اور اس کی سمت کا پتا ہو جس سمت میں معاشرہ حرکت کر رہا ہے۔ ”چاہیے“ کی نوعیت کے تمام مسائل فلسفے کے دائرے میں آتے ہیں جب کہ کسی عملی کام کے لیے فلسفے سے صحیح اصول اخذ نہیں کیے جاسکتے۔ پھر بھی ایچ۔ ایل۔ ایلون (H.L. ELVIN) کے الفاظ ہیں ”عمرانیات، نفسیات، معاشرتی فلسفے اور تعلیمات متقابلہ“ کے علوم تعلیم کے لیے ناگزیر ہیں۔ اس کے تین وجوہ ہیں۔

۱۔ تعلیم سے متعلق ”چاہیے“ کی نوعیت کے سوالوں کا جواب دینے کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہمارے پاس انتہائی حقائق پر مبنی ایسا ٹھوس علم موجود ہو جسے سائنس کے اصولوں کے مطابق مرتب اور منظم کیا گیا ہو۔

۲۔ سائنسی تکنیک ہی وہ واحد تکنیک ہے جسے ہمیں تعلیمی مسائل پر بحث میں استعمال کرنا چاہیے۔ کیوں کہ سائنس ہی نہ کہ فلسفہ یا مذہب علم کے معاملے میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔

۳۔ ”چاہیے“ کی نوعیت کے سوالوں پر بحث و تحقیق سے اگرچہ ہمیں کوئی ایسا حتمی جواب نہیں مل سکتا جس پر سب متفق ہوں، لیکن پھر بھی بہتر اور مناسب فیصلہ کرنے میں ہمیں اس سے مدد مل سکتی ہے۔

انگور کی طرح ایلون بھی منطقی اثباتیت کا حامی ہے، اس لیے وہ بھی مذہب یا ما بعد الطبعیات (METAPHYSICS) کی بجائے تعلیمی نظریے کی بنیاد سائنس کے ٹھوس علم پر رکھنا چاہتا ہے، جس کی آج کل ”علمِ حق“ پر اجارہ داری ہے۔ اس مختصر نمبر کے بعد اب ہم تعلیم کے مختلف نظریات کی طرف رجوع کریں گے۔

تعلیم کے مختلف نظریات

انسان میں دو قسم کے رجحانات بیک وقت کار فرما ہیں۔ ایک پرانی روایات کے احترام کا رجحان، دوسرا نئی چیزوں کو قبول کرنے کا رجحان۔ وہ بیک وقت قدامت پرست بھی ہے اور جدت پسند بھی۔ لیکن ان دونوں رجحانات کی شدت ہر فرد، قوم یا معاشرے میں ایک جیسی نہیں ہوتی۔ انفرادی مزاج، معاشرتی ماحول اور ثقافتی ساخت کے اعتبار سے کسی فرد یا معاشرے میں قدامت پرستی کا رجحان زیادہ شدید ہوتا ہے اور کسی میں جدت پسندی کا۔ ہر تعلیمی نظریہ ان دو رجحانات میں سے کسی ایک کی غماز قرار دیا جاسکتا ہے یعنی وہ قدامت پرستی کا مظہر ہے یا جدت پسندی کا۔ قدامت پرستی نے جس تعلیمی نظریے کو سب سے پہلے جنم دیا وہ تاریخ میں

ابدیت (PERENNIALISM) کے نام سے موسوم ہے۔ بعد میں اس نے مذہب کی قبا اتار کر اصول (ESSENTIALISM) کا فلسفیانہ لباس پہن لیا۔ اسی طرح جدت کے رجحان نے پہلے ترقی پسندی (PROGRESSIVISM) اور تعمیر نو (RECONSTRUCTIONISM) کی شکل اختیار کی جن پر سائنس کے اثرات کی گہری چھاپ ہے۔ تعمیر نو ترقی پسندی ہی کی ایک نئی شکل ہے، جس طرح اصولیت ابدیت کی ایک نئے شکل۔ انھیں فلسفیانہ نظریات کے دو جوڑے کہنا اگرچہ نامناسب نہیں، تاہم ان چاروں میں نمایاں فرق بھی ہے۔

۱۔ ابدیت کا نظریہ

تاریخی اعتبار سے ابدیت کا نظریہ سب سے زیادہ پرانا تعلیمی نظریہ ہے۔ سدا بہار پودے کی مثال اس پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ جس طرح یہ پودا دوبارہ بیج بونے بغیر ہر موسم میں خود ہی اپنی تجدید کرتا ہے، اسی طرح تعلیم میں ابدیت کے حامیوں کی ایسی حقیقت، صداقت اور بالخصوص اقدار کے ایسے اصول دریافت کرنے، سیکھنے اور سکھانے میں ہے جو دوامی، مستقل اور غیر متغیر ہوں۔ وقت کے ساتھ ساتھ جنھیں بدلنے کی ضرورت نہ پڑے۔ صرف ایسے اصول ہی معاشرتی استحکام کی ضمانت دے سکتے ہیں، لیکن ایسے اصول آسانی سے حاصل نہیں ہوتے۔ سخت سے سخت ذہنی ریاضت اور وجدان سمیت ذہن کی مختلف صلاحیتوں کی کڑھی سے کڑھی تربیت بھی ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتی، کیونکہ ان کا سرچشمہ عقل یا انسانی تجربہ نہیں بلکہ وحی الہی ہے۔ خدا پیغمبروں کو ان ابدی اصولوں اور اقدار کا علم عطا کرتا ہے اور وہ ہمیں ان کی تلقین کرتے ہیں علم، اقدار اور سچائی کا سرچشمہ مذہب ہے اور صرف مذہب اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنے ہی پر فرد کی فلاح اور معاشرے کا استحکام موقوف ہے۔ عموماً ہر فرد کو ابدی سچائیوں کی تعلیم دی جاتی ہے، لیکن صرف اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل افراد ہی تعلیم میں یہ سچائیاں اپنی پوری روحانی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہیں عام لوگوں کی تعلیم ایصال و انتقال کی منزل سے آگے نہیں بڑھتی۔

ابدیت کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یونانی دیومالا (MYTHOLOGY) کے زیر اثر افلاطون نے سچائی اچھائی اور حسن کی زندگی کی تین بنیادی اقدار کی حیثیت سے پیش کیا۔ یہ ابدیت کا ایک قدیم نیم شاعرانہ اور نیم مذہبی تصور رہا۔ قرون وسطیٰ کے تین مدرسے (SCHOLASTIC) فلسفے — اسلامی، عیسائی اور یہودی مدرسیت — مذہب اور فلسفے پر مبنی ابدی تعلیم کے شاہکار تھے۔ جدید دور میں ایچ۔ ایچ۔ ہورن (H. H. HORNE) کا فلسفہ اور ایچ۔ ایچ۔ برارڈی (H. S. BRADY) کا تکمیل ذات کا نظریہ اور ان کے

علاوہ ”بنیادی مضامین“ اور ”عظیم کلاسیکی شاہ کاروں“ کی تعلیم کے نظریے بھی ابدیت ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔

۲۔ اصولیت کا نظریہ

ابدیت کی زیادہ تر دلچسپی اخلاقی اقدار میں تھی۔ اس کے برعکس اصولیت کا اصل زور حصول علم اور اس کے انتقال پر ہے۔ ابدیت مذہب کی حلقہ بگوش تھی۔ اصولیت فلسفے کی گرویدہ ہے اور مذہب کی نہیں۔ اس کے رو سے تعلیم کی غایت یہ ہے کہ وہ ان اصولوں، قدروں، قوانین، رسم و رواج اور منہجوں کو نئی نسل میں منتقل کرے جو کسی معاشرے میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک خاص حد کے اندر وہ کبھی کبھی معاشرے میں تغیر و تنوع کی ضرورت کو کھپی تسلیم کرتی ہے، تاہم ابدیت کی طرح اس کی اصل دلچسپی معاشرتی استحکام میں ہے نہ کہ معاشرتی تغیر و تبدیلی میں۔ عملیاتی (EPISTEMOLOGICAL) اعتبار سے سچائی کا انحصار اس بات پر ہے کہ استاد آزمودہ علم کی لازمی حد، موضوعات کو صحیح طور پر نشانہ زد کرنے میں مشغول کرے۔ جہاں تک قدریات (AXIOLOGY) کا تعلق ہے۔ یہ ان سیاسی اقدار کی اشاعت کرتی ہے جو جدید مغربی تہذیب کا جزو لاینفک ہیں۔ وجودیاتی (ONTOLOGIC) اعتبار سے اصولیت حقیقت کے متعلق دو متضاد نظریوں سے منسلک ہے۔

(ا) عینیت (IDEALISM) : اصولیت کے کچھ حامیوں کا نظریہ ہے کہ حقیقت اولیٰ اپنی ماہیت میں ذہنی یا روحانی ہے۔ وہ خیال یا تصور کے مترادف ہے۔ افلاطون کے نزدیک بہ ذہن یا ایک اصل کی نقل ہے، بواعیان یا تصورات کی صورت میں عالم ارواح میں محفوظ ہے۔ لاک، برکلے اور ہیوم کے نزدیک تصور سے مراد اعیان ثابتہ نہیں بلکہ ذہنی کیفیات ہیں۔ ہیگل کے الفاظ میں حقیقت تصور ہے اور تصور حقیقت ہے۔ اس مطلق (ABSOLUTE) عینیت کی رو سے آموزش کوئی تخلیقی کام نہیں بلکہ خیر مطلق، حسن مطلق اور صداقت مطلق کو اپنی ذات میں سمونے کا نام ہے۔

(ب) مادیت (MATERIALISM) : اصولیت کے کچھ ہم نواؤں کا خیال ہے کہ حقیقت نا اولیٰ نالذات جسمانی یا مادی ہے۔ فطرتیت (NATURALISM) اور شئییت (REALISM) مادیت کی دو مختلف شکلیں ہیں۔

بہر حال اصولیت کے حامیوں کی وجودیات خواہ کسی قسم کی ہو، وہ سب اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تعلیم کا اصل مقصد معاشرے میں رائج قوانین، اصولوں اور قدروں کو نسل بعد نسل منتقل کرنا ہے۔

۳۔ ترقی پسندی کا نظریہ

ابدیت اور اصولیت دونوں سکون و ثبات کے فلسفے ہیں۔ معاشرتی استحکام دونوں کا مقصد ہے۔ اس لیے ترقی اور تعلیم اس مقصد کے حصول کا واحد ذریعہ۔ لیکن استحکام کے دائرے میں رہ کر ترقی محال ہے۔ اس لیے ترقی کے حامی ثبات کے بجائے تغیر پر زور دیتے ہیں۔ ”وہ ابدیت اور اصولیت کے ہم نواؤں سے اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ تعلیم، بجا طور پر معاشرتی عقائد اور اقدار کو نئی نسل میں منتقل کرتی ہے، لیکن ان کی اصل دلچسپی نظام انتقال کے بجائے اسلوب حیات کے بدلنے میں ہے“۔ ان کا اصل مقصد معاشرتی نظام کو بدلنا ہے جس کا انحصار تعلیم میں سائنس کے تجرباتی طریق کے استعمال پر ہے۔ جس طرح ابدیت پر مذہب کی چھاپ ہے اور اصولیت پر فلسفہ کی، اسی طرح ترقی پسند تعلیم پر سائنس کا غلبہ ہے۔ وہ طلباء کو وہ طریق فکر سکھانا چاہتی ہے جو سائنس دان اپنے کسی مسئلے کو حل کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔ ڈیوی اس طریق فکر کو مسئلہ (PROBLEM) یا منطوقی (PROJECT) طریق کہتا ہے۔

ترقی پسندی کی بنیاد نتائجیت (PRAGMATISM) کے فلسفے پر ہے جو امریکیوں کا مخصوص فلسفہ ہے۔ اس فلسفے کی رو سے حقیقت اولیٰ تغیر ہے اور صرف تغیر۔ ظاہر ہے کہ تغیر کے اس سیل رواں میں سچائی اور اقدار سے پہلے کوئی بنی بنائی مکمل چیزیں نہیں ہو سکتیں جو شرف قبولیت حاصل کرنے کی منتظر ہوں۔ ان کی اصل شکل و صورت تجربے کے عمل میں متعین ہوتی ہے۔ سچائی کوئی پہلے سے بنی بنائی چیز نہیں بلکہ تجربے کے عمل میں بنتی ہے۔ اسی طرح علم بھی تجربے کا ثمر ہے۔ سچائی علم اور اقدار کا ماخذ ہے کہ تجربہ ہے، اس لیے سچا تجربے کی اس تعمیر نو یا تنظیم نو کا نام ہے جس سے تجربے کی معنویت میں اضافہ ہوا اور جو بعد لے تجربات کا ارتعین کرنے کی لیاقت بڑھائے، ایک لفظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ترقی پسند تعلیم کا اصل زور تجربے پر ہے نہ کہ پہلے سے بنی بنائی اقدار اور علم پر۔

جس طرح ترقی میں تغیر کا مفہوم پوشیدہ ہے، اسی طرح تغیر میں جدت کا مفہوم مضمر ہے۔ جدت سے مراد کسی پہلے سے موجود حقیقت کو، دریافت کرنا نہیں بلکہ صحیح معنوں میں کسی نئی چیز کی تخلیق ہے۔ سب اشیاء ایک

۱۵ تھیوڈور بریملڈ، دی لوز آف ایکسیلو سو آئیڈیاز، لو، ایس۔ ایس۔ یونیورسٹی آف پینسلوانیا، ۱۹۶۵، ص ۲۳

۱۶ جان ڈیوی، ڈیموکریسی اینڈ ایجوکیشن، نیویارک، میکملن اینڈ کمپنی، ۱۹۱۶ء، ص ۱۱۷

ہی وقت میں نہیں بدلتیں اور نہ ہی وہ ایک رفتار سے بدلتی ہیں، اس لیے جدت ایک اضافی تصور ہے۔ پرانی ایشیا ہی نئی چیزوں کو جنم دیتی ہیں۔ یہ ہے وہ تانسجی فلسفہ جس کی بنا پر ترقی کے حامی تعلیم میں وہ طریق فکر اپنانے پر زور دیتے ہیں جو سائنس دان اپنے کسی مسئلے کو حل کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ طریقہ پرانی چیزوں کو نئی چیزیں معلوم کرنے، مانوس ایشیا کو غیر مانوس ایشیا کے بنانے کا ایک وسیلہ سمجھتا ہے اور آئندہ پیش آنے والی نئی صورت حال کے مقابلے کے لیے تیار کرنے میں ترقی کے قابل بنا دیتا ہے۔

دلچسپی اور آزادی ہر ترقی پسند تعلیم کے بنیادی اصول ہیں۔ ڈیوی کے یہاں یہ اصول نتائیجت کے نظریہ علم پر مبنی ہیں۔ ترقی کے کچھ حامی ڈیوی کے بجائے روسو (ROUSSEAU) کو اپنا پیشوا مانتے ہیں، جس نے رومانوی فطرتیت (ROMANTIC NATURALISM) کی بنیاد رکھی لیکن جسے قبولیت عام کا شرف پستالوزی (PESTALOZZI)، فروبل (FROEBEL)، مادام مونٹیسوری (MONTESSORI) وغیر نے بخشا۔ رومانوی فطرتیت کے کئی ترقی پسند تعلیم کی بنیاد "انسانی فطرت" پر رکھتے ہیں۔ بچہ ان کے نزدیک فطرتاً ایک فعال ہستی ہے۔ وہ خود رو حرکت کا پیکر ہے۔ آزادی اس کی روح ہے اور دلچسپی اس کا اصول عمل، جس کے ذریعے وہ اپنی ذات کا بے محابہ اظہار کرتا ہے۔ اس مفہوم میں ترقی پسند تعلیم فطرت کی پیروی کا دوسرا نام ہے۔

تعمیر نو کا نظریہ

سائنس اور ٹیکنالوجی نے دنیا کی شکل بدل دی ہے۔ فاصلے سکر گئے ہیں۔ ساری دنیا ہماری ہمسایہ بن گئی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم قومی معاشروں اور ملکی ثقافتوں کے محدود دائروں سے نکل کر عالمی سطح پر ایک وسیع انسانی معاشرے اور ثقافت کی تشکیل میں براہ راست حصہ لیں۔ اقوام متحدہ کی تنظیم اس سلسلے میں ایک نیک ننگون ہے۔ یہ ہے تعمیر نو کے داعیوں کے نزدیک تعلیم کا اصل مقصد۔ جس طرح ترقی پسندی حال میں مگن رہتی ہے، اسی طرح تعمیر نو کو مستقبل کا نم کھائے جاتا ہے۔ تعمیر نو کا داعی مستقبل کو اپنی وجودیت (Ontology) کا اصل حصہ سمجھتا ہے، کیوں کہ آگے بڑھنا اس کے نزدیک زندگی کا عمومی وصف ہے۔ اگر ہم سنجیدگی کے ساتھ اس بات کے متعلق سوچیں کہ مستقبل میں زندگی کا کیا اسلوب ہوگا اور اس کے مطابق حال کی منصوبہ بندی کریں، تو مستقبل حال میں ایک زندہ قوت بن جاتا ہے اور حقیقت کا جامہ پہن لیتا ہے۔

۷۵ جے۔ ایس برویکر، ماڈرن فیلوسوفی آف ایجوکیشن، نیویارک، میک گراہیل ہک کینی، ۱۹۵۰-ص ۲۹۹

تعمیر نو نے گوترتی پسندی کی اغوش میں پرورش پائی ہے لیکن وہ اس کی اصلاحات کی سست رفتار اور محدود دائرے سے مطمئن نہیں۔ ایک خاصے مستحکم معاشرے کے لیے ترقی پسندی کا پروگرام بالکل ٹھیک ہے، جس پر تبدیلیاں تو آتی ہیں لیکن اسے قائم و دائم رکھنے کے لیے جو اصلاحات کرنا پڑتی ہیں ان کا دائرہ بہت تنگ اور محدود ہوتا ہے۔ دو عالمی جنگوں کی تباہ کاریوں، ایٹمی ہتھیاروں کے تیزی سے بڑھتے ہوئے پھیلاؤ اور بالخصوص اشتراکیت اور سرمایہ داری کی آپس میں بڑھتی ہوئی آدینش نے دنیا کو تباہی کے غار کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ ان حالات میں اکاڈکا اور چھوٹی موٹی اصلاحات کافی نہیں، بلکہ پورے تعلیمی نظام کی از سر نو تعمیر ضروری ہے۔ یہ انسانیت کی بقا کا مسئلہ ہے، اس لیے اس کام میں ہمیں دیر نہ گزرنیں کرنی چاہیے۔

تعمیر نو ترقی پسندی کے مقابلے میں زیادہ مقصد نواز ہے۔ ترقی پسندی کی اصل غرض تعلیمی امور میں سائنس کے تجرباتی طریق کے استعمال سے ہے جب کہ تعمیر نو کی دلچسپی تمدن کے وسیع اغراض و مقاصد سے ہے۔ جو طریقے ان مقاصد کے حصول میں مدد دیتے ہیں، وہ ”گروہی دلچسپی“ اور ”اجتماعی عمل“ کے طریقے ہیں، جنہیں ترقی پسندی نظر انداز کرتی ہے، کیوں کہ ان کی دلچسپی صرف ”بچے کی نشوونما“ میں ہے۔ تعمیر نو اس نوع کی تعلیم کی خواہاں ہے جو عالمی سطح پر ثقافت کی تشکیل نو میں موثر کردار ادا کر سکے، کیوں کہ اس کے نزدیک تاریخ کے جس بھنور میں ہم پھنس چکے ہیں، اس سے نکلنے کی ہم نے کوشش نہ کی تو تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

جارحانہ قوم پرستی اور وطن پرستی کی مسموم فضا میں تعمیر نو کا عالمی ثقافت کا منصوبہ بظاہر ایک مثالی منصوبہ معلوم ہوتا ہے، تاہم یہ غیر حقیقی بالکل نہیں۔ یہ منصوبہ عوام الناس کی زیادہ سے زیادہ خود افزوی پر زور دیتا ہے۔ عوام الناس چوں کہ زیادہ تر مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں پر مشتمل ہوتے ہیں، اس لیے تعمیر نو کی تعلیم پر محنت کش طبقے کی چھاپ ہوگی۔ لیکن اس قسم کی تعلیم کا اہتمام صرف ایک فلاحی مملکت ہی کر سکتی ہے جو عوام کی بہبود کی خواہاں ہو، جس میں جمہوریت کا بول بالا ہو اور انسان کے احوال کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ اس منصوبے پر اتفاق رائے عوامی آئیڈیالوجی کی صورت میں پہلے ہی موجود ہے۔ یہ مشترک عقائد، اقدار، عادات اور اطوار جن پر عوامی آئیڈیالوجی مشتمل ہوگی، ایک طرح کے گروہی ذہن کا تصور پیش کرتے ہیں اور معاشرتی اعتبار

سے زندگی کی ایک عمومی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کا لحاظ رکھنا فلسفہ تعلیم کے لیے ازلیں ضروری ہے۔
اس منصوبے میں شرکت کی نوعیت خالصتاً رضا کارانہ ہے اور عوام کی اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ سکول کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کی جبری ترغیب دے، لیکن استاد یا شاگرد جب ایک مرتبہ اس کا قائل ہو جائے تو وہ بے شک اس کا پروپیگنڈا کر سکتا ہے۔

ابدیت، اصولیت، ترقی اور تعمیر نو کے چار نظریوں میں سے کوئی تعلیمی نظریہ بھی جیسا کہ بریملڈ (BRA MELD) - کتاب ہے، اپنی جگہ پر مکمل اور کافی بلاذات نہیں، بلکہ ایک مخصوص ثقافتی پس منظر میں زیادہ سے زیادہ ایک تناظر کی ایک حیثیت رکھتا ہے۔ ہر نظریہ دوسرے نظریوں سے بہت کچھ لیتا ہے اور انہیں بہت کچھ دیتا بھی ہے۔ اس لیے یہ کہنا بہتر ہو گا کہ وہ سب ایک سلسلے میں کام کرتے ہیں۔ انہیں قطع طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ یہ نظریے آج کل کی فلسفیانہ فکر کی تمام انواع کا احاطہ نہیں کرتے۔ جدید فلسفوں میں وجودیت (EXISTENTIALISM) نے تعلیمی فکر پر گہرا اثر ڈالا ہے، لیکن تعلیمی فلسفے صرف جزوی طور پر ہی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ اللہ

۵۔ اقبال کا نظریہ تعلیم

تعلیم کے جن چار نظریوں سے ہم نے اوپر بحث کی ہے اس سے ایک بات واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ وہ معاشرتی استحکام پر زیادہ زور دیتے ہیں یا معاشرتی تعمیر پر، اور اسی کے مطابق علی الترتیب اپنی سچائیوں اور آزمودہ اصولوں کو مرکزی حیثیت دیتے ہیں یا ”متواتر نمو“ اور ”عالمی ثقافت“ کو۔ ابدی سچائیوں کا سرچشمہ مذہب ہے۔ آزمودہ اصول مذہب فراہم کرتا ہے اور فلسفہ بھی۔ ”متواتر نمو“ کا ضامن سائنس کا مستعملی طریق ہے۔ ”عالمی ثقافت“ کی تشکیل ”گروہی دلچسپی“ اور ”اجتماعی عمل“ پر موقوف ہے۔ اقبال کے

۱۵ ج، ایس برویکر، کتاب مذکور، ص ۲۵

اللہ اس رجحان میں اب کچھ کمی آ رہی ہے۔ رسالوں میں جستہ جستہ مضامین شائع ہونے کے علاوہ اس موضوع پر

اب ميسود کتابیں بھی شائع ہو رہی ہیں، جن میں یہ دو کتابیں قابل ذکر ہیں: جی، ایف، نیڈر (KNELLER)، اکرستینشیا

لزم اینڈ ایجوکیشن، نیویارک، جان ولی اینڈ سنز، ۱۹۵۸ - برنارڈ گرش (CURTIS) اینڈ ولف میز (MAYS)

فیوینولوجی اینڈ ایجوکیشن، لندن، میتھوئن اینڈ کمپنی، ۱۹۷۸ -

نزدیک تعلیم کا محور ابدی سچائیاں ہیں جو مذہب ہمیں فراہم کرتا ہے۔ دینی عقائد اور اقدار کی اساس پڑ زندگی کی سطح کو بتدریج بلند کرنے کے لیے، ایک مستحکم اور "متناسب عمرانی نظام" قائم کیا جاسکتا ہے۔ تعلیم کا اصل مقصود چوں کہ معاشرتی استحکام ہے، اس لیے اقبال خالصتاً مذہبی مفہوم میں ابدیت کے نظریے کے حامی ہیں۔ لیکن تعلیم کا مقصود ان کے نزدیک معاشرے کی صرف بقا اور استحکام ہی نہیں، بلکہ اس کی نمو اور ترقی بھی ہے۔ مستحکم معاشرے کی اساس بے شک قانونِ الہی ہے۔ یہ قانون روحانی ہے اور ابدی بھی، لیکن جامد ہرگز نہیں۔ اس کی روحانیت اور ابدیت جہاں استحکام میں جلوہ فگن نظر آتی ہے، وہاں تغیر و تنوع میں بھی اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ "جس معاشرے کی بنیاد حقیقتِ مطلق کے اس تصور پر ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ثبات اور تغیر دونوں خصوصیات کا ایک سماں طور پر لحاظ رکھے۔ اس کے پاس ضرور کچھ ایسے ابدی اصول ہونے چاہئیں جو اجتماعی زندگی میں نظم و ربط قائم رکھیں، کیوں کہ ہر آن بدلتی ہوئی اس دنیا میں ہم اپنا قدم مضبوطی سے جما سکتے ہیں تو ان ہی کی بدولت۔ لیکن یہ ابدی اصول و تغیر و تبدیلی کے امکانات کو بالکل ختم نہیں کر دیتے کیوں کہ تغیر قرآن کی ربو سے اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نشانی ہے جسے نظر انداز کر کے ہم اس شے کو جس کی فطرت ہی حرکت ہے، حرکت سے عاری کریں گے" ^۱

تغیر اور ترقی کی اہمیت کو تسلیم کر کے اقبال ابدیت کے حلقہ بگوش ہونے کے باوجود ترقی کے حایموں کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں۔ زندگی چوں کہ نمونہ پذیر ہے، اس لیے تعلیم کو چاہیے کہ وہ اس کی قوتِ نمونگی آب یاری کرے۔ لیکن "ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ زندگی محض تغیر ہی نہیں، اس میں حفاظت و ثبات کے بھی کچھ عناصر موجود ہیں۔ اپنی تخلیقی سرگرمیوں سے لطف اندوز ہونے اور اپنی قوتوں کو ہمیشہ زندگی کی نئی جہتیں معلوم کرنے پر مرکوز کرنے میں جب انسان پر اس کی اپنی ذات عیاں ہوتی ہے تو وہ ایک قسم کا اضطراب محسوس کرتا ہے۔ آگے بڑھنے کی کوشش میں وہ اپنے ماضی کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا اور خود اپنے داخلی پھیلاؤ پر اسے گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے۔ آگے کی طرف بڑھنے میں ایسی قوتیں اس کی مزاحمت کرتی ہیں جو مخالف سمت میں کام کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں زندگی ماضی کا بوجھ اپنی مکر پراٹھائے آگے بڑھتی ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ معاشرے میں تغیر و تبدیلی کا جو نقشہ ہم نے تیار کیا ہے، اس

^۱ علامہ اقبال، "دعا"، نیشنل پبلشرز، آف رینجس تھاٹ ان اسلام، شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۱۲۸، ۱۲۷

میں تقلید کی قوتوں کی قدر و قیمت فراموش نہ کریں۔... کوئی قوم اپنے ماضی کو یکسر نہیں بھلا سکتی، کیوں کہ ماضی ہی نے ان کے ذاتی تشخص کی تشکیل کی ہے۔^{۱۳}

پس اقبال کو اصولی طور ابدیت کے قائل ہیں، لیکن وہ تغیر و ترقی کو اس کے دائرے سے خارج نہیں سمجھتے۔ قانون الہی ہر چند ابدی اور دوامی ہے، لیکن اس کے باوصف وہ ساکن و جامد ہرگز نہیں۔ وہ تغیر، ترقی اور حرکت کی نفی نہیں کرتا۔ اسلام اعتدال اور توازن کا دین ہے۔ وہ ثبات و تغیر اور تقلید و ترقی میں اعتدال قائم کر کے معاشرے کے بقا اور اس کے نمودوں کا سامان مہیا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نہ جامد ابدیت کے حامی ہیں اور نہ ہی بے مہارت ترقی کے۔ وہ ان دونوں عناصر کو اپنے نظریہ تعلیم میں مساوی جگہ دیتے ہیں۔ اسلام میں حرکت اور ترقی کے اصول کا نام اجتہاد ہے۔^{۱۴} جس کے ذریعے ”فکر دینی کو از سر نو تعمیر کرنا۔“ ان کے نزدیک تعلیم کا اولین فرض ہے۔ لیکن تعمیر نو سے ان کی مراد صرف ایک ”نئی دینیات اور کلام کی تعمیر“ اور فقہ اسلامی کی تشکیل نو ہے جس کی نظیر یہیں فقہائے متقدمین کے یہاں ملتی ہے۔ جب وہ ”اجتہادی گہرائیوں کو دوبارہ حاصل کرنے“ پر زور دیتے ہیں تو اس سے ان کا مقصد ”فکر دینی“ کی صرف اسی قسم کی تعمیر نو ہے۔ اپنے مشہور خطبات کا نام، جو ۱۹۳۰ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئے، ”تشکیل جدید الہیات اسلامیہ“ رکھنے میں بھی یہی مقصد کار فرما ہے۔

اس کے علاوہ اقبال رومانی فطرتیت کے مفہوم میں بھی ترقی پسند تعلیم کے حامی ہیں۔ ان کے نزدیک ”بچہ ایک معلم ہستی نہیں بلکہ سر یا ایک متحرک ہستی ہے جس کی ہر طفلانہ حرکت سے کوئی نہ کوئی تعلیمی فائدہ اٹھانا چاہیے۔“ کیوں کہ اسی پر اس کی ”جسمانی اور روحانی نمو“ کا دار و مدار ہے۔ تعلیمی عمل کو بچے کی خود متحرکی پر مرکوز کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اُسے اپنی دلچسپیوں کے مطابق تجربے کے ذریعے سیکھنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اور دلچسپی اور آزادی ہی وہ اصول ہیں جن پر ترقی پسند تعلیم کی بنیاد استوار ہے۔ لیکن یہ رومانی فطرتیت اقبال

۱۳۷ ایضاً، ص ۱۶۶، ۱۶۷

۱۳۸ ایضاً، ص ۱۳۸

۱۳۹ محمد حسین خاں زبیری، مولف، مشاہیر کے تعلیمی نظریے، کراچی، جاوید پریس، س. ن. ص ۲۷۰

۱۴۰ ایضاً، ص ۲۷۱

۱۴۱ اقبال، کتاب مذکور، ص ۱۶۸

۱۴۲ سید عبدالواحد معینی، داہن۔ مقالات اقبال۔ شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۳۷

۱۴۳ ایضاً، ص ۳

پر زیادہ دیر تک حاوی نہیں رہی۔

تعمیر نو کے مغربی علم برداروں کو انسانیت کی نجات اس میں نظر آتی ہے کہ تعلیم قومی معاشروں اور ملکی ثقافتوں کے محدود دائروں سے نکل کر ”عوامی آئیڈیالوجی“ کی صورت میں عالمی ثقافت کی تشکیل میں مدد دے۔ اقبال کو اس قسم کی کسی آئیڈیالوجی کی تشکیل کی ضرورت نہیں پیش آتی، کیوں کہ ان کے نزدیک نظریۂ اہدیت خود ”اخوت کی جہاں گیری“، ”محبت کی فراوانی“ اور ”انسانیت کے احترام“ کی تعلیم دیتا ہے جو مشترک ماوی اغراض کے مقابلے میں نوع انسانی کی وحدت کے لیے ایک زیادہ پائیدار روحانی اساس مہیا کرتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کی اس ابدی تعلیم پر صدق دل سے عمل کیا جائے۔ چنانچہ وہ نہایت ہی پُر زور الفاظ میں کہتے ہیں کہ ”جب تک تمام دنیا کی علمی قوتیں اپنی توجہ کو محض احترام انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کر دیں، یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی رہے گی۔ کیا ہم نے نہیں دیکھا کہ ہسپانیہ کے باشندے ایک نسل، ایک زبان، ایک مذہب اور ایک قوم رکھنے کے باوجود محض اقتصادی مسائل کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنے تمدن کا نام و نشان مٹا رہے ہیں۔ اس ایک واقعے سے صاف ظاہر ہے کہ قومی وحدت بھی سرگز قائم و دائم نہیں۔ وحدت صرف ایک ہی محترم ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو رنگ و نسل و زبان سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملکیت کی لغتوں کو مٹایا نہ جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا، جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو مٹایا نہ جائے گا، اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکے گا اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندہ معنی نہ ہوں گے۔“

ہم سب آدم کی اولاد ہیں اور اس لیے آپس میں بھائی بھائی۔ نہ عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل ہے اور نہ عجمی کو عربی پر۔ نہ گورا کالے سے افضل ہے اور نہ کالا گورے سے۔ صرف اور صرف اسی بنیاد پر دنیا کو ایک ایسی وسیع بلندی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے، جس میں حریت، اخوت اور مساوات کا بول بالا ہو۔

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی
 اخوت کی جہاں گیری، محبت کی فراوانی
 بتانِ رنگ و نوحوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
 نہ تو رانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

۱۱۵ لطیف احمد شروانی، مولف، حرفِ اقبال، لاہور، المنار ایڈمی، ۱۹۴۷ء۔ ص ۲۴۶-۲۴۷

۱۱۶ کلیاتِ اقبال اردو۔ لاہور، شیخ غلام علی ایڈسنز، ۱۹۷۵ء، ص ۲۷۰